شیخ غلام قادر گرامی
اور
علامہ اقبالؒ

ڈاکٹر تسکینہ فاضلی

شیخ غلام قادر گرامی کا سن پیدائش ۱۸۵۶ء (بمقام جالندھر) بتایا گیا ہے مگر اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی کے الفاظ میں "اگر اسے (۱۸۵۶ء) صحیح تسلیم کر لیا جائے تو وفات کے وقت (۱۹۲۷ء) ان کی عمر ۷۱ برس کی تھی۔ لیکن گرامی جون ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں کسی غزل کی داد دیتے ہوئے اقبال کو لکھتے ہیں، مُلا نظیری نے آپ کو اپنا جانشین انتخاب کیا ہے۔ گرامی ہفتاد سالہ ہو گیا ہے۔ یہ دولت نہ ملی۔ اس اعتبار سے گرامی کی عمر کم و بیش ۷۵ برس کی ہوئی مگر معلوم ہوا کہ وفات سے قبل گرامی اپنی عمر ۸۰ سے بھی اوپر بتائے تھے" ۱؎

گرامی کے والد کا نام شیخ سکندر بخش تھا جنہیں لوگ کندا کندا کہتے تھے۔ شیخ سکندر بخش ککے زئی قوم کے ایک آسودہ حال بزرگ تھے۔ ان کے یہاں نیل کی رنگائی کا

۱؎ محمد عبداللہ قریشی۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۴-۱۵

کام وسیع پیمانے پر ہوتا تھا عام دستور کے مطابق گرامی کو ابتداء میں محلے کی مسجد میں قرآن پاک پڑھنے اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا گیا۔ اس کے بعد فلیفہ ابراہیم کے مکتب میں بٹھائے گئے۔ جو بستی دانشمنداں (جالندھر) میں واقع تھا۔ وہاں گرامی نے فارسی کی متداول درسی کتب گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھیں۔ گرامی کو علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ وہ لاہور آئے اور چودہ برس کی عمر میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور فارسی کے امتحانات منشی عالم اور منشی فاضل پاس کئے۔ اس کے بعد انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا مگر وکالت کو پیشے کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ گرامی بچپن سے ہی عجیب و غریب طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے ہم جماعتیوں سے جدا رہتے تھے اور ان پر مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ چنانچہ لڑکے انہیں مست کہا کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق شروع سے ان کی طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے ہم جماعتیوں سے جُدا جُدا رہتے تھے اور ان پر مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ چنانچہ لڑکے انہیں مست کہا کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق شروع سے ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا۔ فارسی کتب کے مطالعے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ محمد عبداللہ قریشی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"گرامی کو شاعرانہ مزاج قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ شاعری کی طرف فطری میلان کی وجہ سے گلستان بوستان اور سکندر نامہ کا مطالعہ سند ناز پر اک اور تازیانہ ہوا اور طبیعت کی مناسبت سے بچپن ہی میں غیر شعوری طور پر فقرے موزون کرنے لگے۔" [1]

گرامی نے فارغ التحصیل ہو کر امرتسر کے ایم اے او ہائی اسکول میں معلمی اختیار کی لیکن نوکری سے دل برداشتہ ہو کر اسے جلد ہی خیرباد کہہ دیا اور ریاست کپورتھلہ آ گئے جہاں ان دنوں شعر و شاعری کا خوب چرچا تھا۔ شعر و شاعری کی یہ فضا گرامی

---

[1] محمد عبداللہ قریشی۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۶

کی طبیعت کے لئے موزون تھی۔ اس لئے یہاں ان کا دل خوب لگا۔ یہاں فارسی کے شاعر ترکی بھی تھے جن سے ان کی نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ کپورتھلہ میں مقیم رہے اور پھر لدھیانہ گئے۔ لدھیانہ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ یہ نوکری بھی ترک کر کے وہاں کے سپرانٹنڈنٹ پولیس مسٹر بارئین کی تحریک اور اصرار پر پولیس میں سارجنٹ درجہ اول بھرتی ہو گئے۔ مسٹر بارئین فارسی ادب کے بڑے شیدائی تھے۔ اور گرامی کو اکثر و بیشتر بلا کر ان سے فارسی کے اشعار سنتے تھے۔ گرامی کا طبعی میلان پولیس کی نوکری کے خلاف تھا اس لئے اس سے بھی سبکدوش ہوئے اس کے بعد مختلف جگہوں پٹیالہ، رامپور اور مالیر کوٹلہ وغیرہ میں گھومے پھرے اور نوکریاں کیں لیکن ان کا دل یہاں بھی نہ لگا۔ اس کے بعد ان کے مقدر کے درخشاں ستارے نے انہیں دکن کھینچ لیا جہاں پٹیالہ کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین کی سفارش لے کر حیدر آباد پہنچے اور ریذیڈنٹ کے توسط سے جلد ہی میر محبوب علی خان کے (جو وائی دکن تھے) دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ یہاں انہیں بلگرامی کی جگہ شاعر خاص کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ نظام دکن نے انہیں اپنا اُستاد بنایا اور ان کی بڑی قدر افزائی کی کئی سال کے بعد انہیں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۳۵ برس کی طویل مدت تک دکن میں قیام کیا۔ اس دوران اپنے عزیز و اقربا سے ملنے کے لئے کئی مرتبہ پنجاب آئے۔ ۱۹۱۶ء میں ذیابیطس کے مرض کے شکار ہوئے۔ اس مرض نے روز بروز شدت اختیار کی جس کی بناء پر چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ بالآخر ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو پنجشنبہ کے روز ہوشیار پور میں انتقال کیا۔

گرامی مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہایت پاک باطن اور نیک سیرت آدمی تھے۔ کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ نہایت ہی وسیع الاخلاق تھے۔ ہر شخص کے لئے تحسین و آفرین کے کلمات استعمال کرتے تھے۔ اپنے احباب پر مہربان تھے۔

گرامی فارسی کے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے لیکن وہ اپنے کلام کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں بے اعتنائی برتتے تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ زبانی بہت کچھ یاد تھا مگر پوری طرح سے کبھی کلام بیاض میں محفوظ نہ رکھا۔ انہوں نے حیدرآباد میں بہت کچھ کہا اور وہاں کہا ہوا اکثر کلام تلف ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی عزیزالدین عظامی اور حضرت میاں علی محمد صاحب سجادہ نشین لسی نواں (ہوشیارپور) نے کوشش کرکے "دیوان گرامی" اور "رباعیات گرامی" کے نام سے ان کے کلام کے دو مجموعے شائع کئے۔ گرامی کے دیوان میں حمد، نعت، غزلیں اور قصائد و قطعات ملتے ہیں۔ انہوں نے مولانا روم کے تتبع میں ایک مثنوی شروع کی تھی لیکن "بھاری پتھر سمجھ کر چوم کے چھوڑ دی"۔ غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگِ عشق" کے جواب میں "خرابات جنون" لکھنے کی کوشش کی لیکن اسے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ گرامی نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی شان میں ایک منقبت کہی تھی اور اس کی شرح فارسی نثر میں "راہ فردا" کے نام سے لکھی۔ یہ شرح گرامی کے اردو مقدمے کے ساتھ امرتسر سے شائع ہوئی۔ ان کا دیوان تمام تر فارسی میں ہے۔ اردو میں ان کی اکا دکا تحریر ہی ملتی ہے محمد عبداللہ قریشی ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جدید فارسی زبان کا اثر ان کے کلام پر مطلق نہ تھا۔ وہ کلاسیکل فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ ان کو ایک طبعی مناسبت تھی اور تراکیب وضع کرنے میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔ جدید فارسی تراکیب اور الفاظ سے اجتناب بھی ان کے صحیح ذوق شعر کی ایک دلیل ہے۔ ان کے جذبات گہرے اور افکار بلند ہوتے تھے۔ وہ تقریباً ہر وقت فکر سخن میں مصروف رہتے تھے۔" [۱]

---

[۱] محمد عبداللہ قریشی۔ معاصرین اقبال کی نظر میں۔ ص ۱۹

گرامی کئی اصنافِ سخن مثلاً "غزل" مثنوی اور رُباعی پر قدرت رکھتے تھے مگر چونکہ انہیں صنفِ غزل کے ساتھ گہرا شغف تھا اس لئے انہوں نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں۔ ان کی چند غزلوں کے مطلعے بطور نمونہ پیش ہیں۔

عشق آمد و از عقل فسونگر نتواں گفت
پیداست کہ از پنہ و اخگر نتواں گفت
پنہانم و پیدایم کیفم بشراب اندر
پیدایم و پنہانم داغم بکباب اندر
دلم غریب و دو چشم تو قاتل افتاداست
یکی غریب و دو قاتل چہ مشکل افتاداست

گرامی نے طویل ردیفوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن بہت کم۔ اُن کی رباعیات کا مجموعہ "رباعیات گرامی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ زندگی کے آخری دو تین برسوں میں ان کی طبیعت طول نویسی کا بار برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف رباعیات ہی کہتے رہے۔ رباعی کا فن نہایت ہی مشکل فن ہے۔ یہ شاعر سے ریاضت اور پختگی کا تقاضا کرتا ہے۔ گرامی نے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی رباعیات میں اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

خاور چکد از شبنم بایں تیرہ شبی
کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی
اے دوست ادب کہ در حریم دل ماست
شاہنشہ انبیا رسولِ عربیؐ
اے ختم رُسل جان جہاں فار قلیط
خوانند ترا بر آسماں فار قلیط
می گفت مسیح در بشارات جلیل
من میروم آید بجہاں فار قلیط
اے ساقی ما بادہ بدہ عصمت خیز
کامد با دار و گیر باطل بستیز
در ساغرم اے ساقی خمخانۂ راز
آں بادہ ز رمز اسم احمدؐ ریز

گرامی اقبال کے بزرگ معاصر تھے۔ اقبال کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے قائل تھے۔ انہوں نے گرامی کے نام بہت سے خطوط وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ جن سے دونوں کے دوستانہ تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ علامہ اقبال ہی تھے جو انہیں اپنا کلام ارسال کرنے اور اس متاع گراں بہا کو منظر عام پر لانے کے متعلق اکساتے تھے۔ جیسا کہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہے:-

"اگر آپ اپنا کلام مجھے ارسال فرماتے رہیں تو میں تھوڑے عرصہ میں آپ کا مجموعہ تیار کر کے دنیا کے سامنے اس بے بہا خزانے کو پیش کروں گا۔ افسوس ہے آپ نے اب تک اس طرف توجہ نہ کی۔ جو کچھ یاد آتا ہے، لکھتے جائیے اور مجھے بھیجتے جائیے۔ اس زمانۂ انحطاط میں کسی مسلمان کا ایسا کلام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی کی قوتیں ابھی باقی ہیں"۔ [۱]

ایک مرتبہ اقبال نے گرامی سے اصرار کر کے انہیں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی غرض سے لاہور مدعو کیا تو گرامی کی نظم شروع ہونے سے پہلے انہوں نے گرامی کا تعارف کراتے ہوئے کہا:-

"اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے۔ گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا اور دیکھا ہے۔" [۲]

گرامی کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ اشعار، غزلیں یا نظمیں تو درکنار انہیں پوری پوری مثنویاں تک ازبر تھیں۔ انہیں فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ بقول اقبال انہیں اپنا سارا کلام یاد تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ گرامی اور اقبال دونوں ساتھ بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں اسد ملتانی اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں کے درمیان مختلف موضاعات

۱؎ مکتوب اقبال بنام گرامی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء بحوالہ مکاتیب اقبال بنام گرامی (محمد عبداللہ قریشی) ص ۱۴۰،۱۴۱

۲؎ ایضاً ص ۳۰

پر بڑی دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ جب فارسی زبان کا ذکر چھڑ گیا تو اقبال نے گرامی کے متعلق اسد ملتانی سے کہا :۔

"ابھی ان کے (گرامی کے) حافظے کا کرشمہ دیکھیئے۔ یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی۔

وہ اُٹھ بیٹھے۔ کہا کہ مولانا! حضرت نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے ؟

زگرد بیاباں بیاباں گرد

بس اس مصرعے کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے۔

اللہ اللہ اللہ اللہ

اس کے بعد ایک دو بار اس مصرع کو دہرایا اور پھر وہیں سے مثنوی شروع کر دی۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر پڑھتے گئے۔ [۱]

اقبال گرامی کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ انہوں نے مولانا کے کلام کو وقتاً فوقتاً سراہا ہے۔ اقبال اپنے اشعار گرامی کو بھیجتے تھے اور ان کی رائے طلب کرتے تھے ایک مرتبہ اقبال نے اپنے چند اشعار گرامی کو بھیجے تو انہوں نے کچھ مشورے دیئے اور تحریر کیا کہ شعر میں لفظ قادرؔ استعمال کیا جائے۔ اقبال نے بعد میں دونوں مصرعوں میں مادر کا لفظ استعمال کیا۔ یوں تو گرامی نے ایک معمول اشارہ کیا تھا لیکن اس معمول اشارے نے اقبال کے ذہن کو کسی اور گوشے کی طرف منعطف کیا اور اسطرح انہیں خاصا فائدہ ہوا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں گرامی کو لکھتے ہیں :۔

"حضرت فاطمہ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے۔ اس کے آخر کے

اشعار اسطرح ہیں۔

[۱] جعفر بلوچ۔ اقبالیات اسد ملتانی ص ۵۲ - ۵۳

مادر آں مرکز پرکار عشق　　مادر آں کارواں سالار عشق
آں یکے شمع شبستانِ حرم　　حافظ جمعیت خیر الامم
تا بمیرد آتش پیکار و کیں　　پشت پازد بر سر تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں　　قوت بازوئے احرار جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسین　　اہل حق حریت آموز از حسین

"آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں "مادر" کا لفظ ہونا چاہیئے معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا، جس کے بیان کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ میں نے اس اشارہ سے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے اشعار میں حضرت حسن و حسین دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ، ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہیں، ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی۔ اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کرنا چاہتا ہوں، غور فرما کر کوئی اشارہ دیجئے۔" [1]

اقبال کو جب کوئی شعر پسند آتا تھا یا ان کی نظر سے کوئی تخلیق گزرتی تھی تو اسے گرامی کی خدمت میں بھیجتے اور اس کی باریکیوں پر گرامی کو بھی شریک گفتگو کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گرامی جب کسی شعر میں تصرف کرتے تھے تو اقبال اس کی تعریف کرتے تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"گرامی کے تصرف کا صلہ دست بوسہ ہی تھا۔ البتہ عرفی کے عتاب کو میں حق بجانب سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ عرفی کا پہلا مصرعہ اس قابل ہے کہ اس میں تصرف کیا جائے اور لفظ "دراز" شعر کو زندہ

[1] محمد عبداللہ قریشی مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۳۱

کرنے کیلئے ضروری ہے مگر بحیثیت مجموعی آپ کا مصرعہ براہ تست مرا رشتہ امید دراز" کھٹکتا ہے بھلا اگر یوں لکھیئے تو کیا ہو۔

ز فیضِ مژدہ لطف تو روز عیش دراز

بہ عہد وعدۂ وصل تو عمرِ غم کوتاہ ؎۱

اقبال گرامی کے اشعار پر مناسب داد دیتے تھے۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے :۔

آپ کی رباعی کی داد دینا بھول گیا تھا

با خود در بےخودی رسیدن سہل است

بےخود در خود رسی حضوری ایں است

سبحان اللہ! ایک نہایت طویل و عریض مضمون کو آپ نے ایک مصرع میں بند کر دیا ہے۔ سلطان ابوالخیر کی روح بھی تڑپ اُٹھی ہوگی" ؎۲ گرامی کے اس شعر

کتابِ عقل ورق در ورق فرو خواندیم

تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است

پر اقبال لکھتے ہیں :۔

" مضمون میرے حسبِ حال تھا۔ تمام عمر کتابوں کی ورق گردانی میں گزری اور آخر یہ معلوم ہوا کہ کتاب حیلہ فروشی اور مدعا طلبی کے سوا کچھ نہیں۔ عقل اس سے بڑھتی ہے مگر دل روشن

۱؎ محمد عبداللہ قریشی۔ روح مکاتیب اقبال۔ ص ۲۶۱

۲؎ ص ۱۸۳

نہیں ہوتا۔ آپ کا شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں میں اس زور کے ساتھ
آنسو اُمڈے کہ ضبط نہ کر سکا" ع۱

اقبال اس بات کے خواہاں تھے کہ گرامی ان کے اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ایک مرتبہ گرامی نے ان کی غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا تو بعد میں اقبال نے انہیں لکھا کہ براہِ کرم غزل کے تمام اشعار پر اعتراض کیجیے۔ کیونکہ اعتراض اور تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلا تکلف عرض کر دیا کرتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے۔ مجھے تعریف سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جتنی اعتراض سے۔ کیونکہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے"۔ ع۲

اقبال گرامی کی تنقیدوں سے اکتساب فیض کرتے تھے۔ گرامی نے بھی اقبال کی تنقیدوں سے فیضان حاصل کیا ہے ایک مرتبہ انہوں نے اپنی ایک غزل رسالہ "ہمایوں" میں شائع کرانے کیلئے اقبال کو بھیجدی۔ اقبال نے میاں بشیر احمد کو پہنچانے کی بجائے بعض باتوں کی طرف توجہ دلا کر گرامی کو واپس بھیجدی کہ اس پر نظر ثانی کریں۔ اس غزل کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"میں نے یہ نہ چاہا کہ شائع ہونے کے بعد کوئی اس پر اعتراض کرے۔ اس واسطے بعض باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلائی۔ اگر آپ کو مجھ سے اتفاق نہ ہو تو اسی طرح رہنے دیجئے کیونکہ آپ کا مذاق زیادہ معتبر ہے" ع۳

ع۱ محمد عبداللہ قریشی۔ روحِ مکاتیب اقبال۔ ص ۲۷۵

ع۲ مکتوب اقبال بنام گرامی بحوالہ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی) ص ۶۲

ع۳ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی) ص ۶۸ - ۶۹

گرامی نے جواب میں لکھا کہ غزل واپس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی اصلاح کر دی ہوتی۔

گرامی فارسی شعر و ادب کی ایک جامع شخصیت تھے اور اقبال کے گہرے دوست بھی تھے۔ جب اقبال نے اپنے بلند افکار کے اظہار و ابلاغ کے لئے فارسی کو زبان ذریعہ اظہار بنایا تو انہیں بعض نازک اور باریک نکتوں کی خاطر فارسی کے کسی اہلِ نظر اور رمز شناس سے مذاکرات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کی نظر میں گرامی ایک مناسب اور موزون شخصیت تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی طرف رجوع کیا۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

"اقبال رموزِ بے خودی کی تصنیف میں مصروف تھے اور انہیں قدم قدم پر گرامی کے مشورے کی ضرورت پیش آتی تھی چنانچہ رموزِ بے خودی کے سب سے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں، جو بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کر دیا گیا، گرامی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اُستاذی علامہ میر حسن صاحب اور مولانا شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ و اجلالہ میرے شکریئے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابل قدر مشورہ ملا" [1]

اقبال اکثر اوقات اپنے خادم علی بخش کو (جو ہوشیارپور کا رہنے والا تھا) گرامی کے پاس بھیجتے تھے تاکہ انہیں لاہور بلا لیں۔ گرامی جب اقبال کے مہمان ہوئے۔ تو وہ ان کی ناز برداریاں کرتے۔ ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے۔ ان سے گفتگو کرتے اور شاعری کے نکات پر بحث مباحثہ ہوتا۔ اقبال انہیں اپنا کلام سناتے اور وہ گرامی سے ان کے اشعار سنتے اور مستفید ہوتے۔ ان کی تنقیدوں اور موشگافیوں سے اکتساب

---

[1] دیباچہ رموزِ بے خودی پہلا ایڈیشن۔ بحوالہ مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی) ص ۲۸-۲۹

فیض کرتے۔ جب گرامی اقبال کے یہاں پہنچ جاتے تو پھر لوٹنے کا نام نہ لیتے۔ ان کی بیگم بیماری کا بہانہ کرکے انہیں بلاتیں مگر گرامی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ پھر کئی روز کے بعد جب جانے کی تیاری کرتے تو اقبال کہتے کہ آپ جس وقت جانا چاہیں گے میں اُسی وقت بھجوادوں گا۔ لیکن ایک رُباعی ذہن میں اڑ گئی ہے۔ تین مصرعے ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا باقی ہے۔ ذرا اس پر غور فرمایئے۔ شاید مصرعہ ہو جائے۔ یہ بات سنتے ہی گرامی چوتھے مصرعے کی فکر میں اس طرح مستغرق ہو جاتے کہ بیگم کا خیال ہی نہیں رہتا۔ اقبال یونہی مصرعہ نہ سوجھنے کا بہانہ کرتے۔ ان کا مدعا یہ ہوتا تھا کہ گرامی کسی طرح کچھ دن اور قیام کریں یہ معاملہ یک طرفہ نہ تھا بلکہ گرامی بھی اقبال کی صحبتوں سے محظوظ ہوتے۔ بعض لوگوں نے دونوں کے اخلاص، عقیدت اور محبت کو اُستادی اور شاگردی کے رشتے پر مبنی قرار دیا ہے[1] حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دونوں بڑی شخصیتیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں۔ اقبال نے گرامی کو "پیر مغاں" کہا ہے وہ انہیں ولی سمجھتے تھے۔ اقبال کو گرامی کی نیت اور نیک نفسی پر یقین واثق تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے نزدیک گرامی کی نیت اور نیک نفسی مشکوک ہے وہ کافر ہے۔ اقبال کے نزدیک گو گرامی کا جسم فانی ہے لیکن انہیں اپنے کارناموں کی بدولت حیات جاوداں حاصل ہے۔ اقبال نے انہیں "پیر کہن" کہا ہے۔

"گرامی معجز نگار ہندوستان کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش۔ اے پیر کہن" [2]

---

[1] ۱۹۲۵ء میں رسالہ شمع آگرہ کے ایڈیٹر حسن عابد جعفری صاحب نے مولانا گرامی کی ایک فارسی غزل پر تعارفی نوٹ میں تحریر کیا تھا کہ اقبال کو گرامی سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ اس پر اقبال نے اُسی وقت ایڈیٹر کو لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں اور اس طرح یہ غلط فہمی رفع کردی۔

[2] مکتوب اقبال بنام گرامی بحوالہ مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتب محمد عبداللہ قریشی) ص ۲۷

دیوان گرامی اور رباعیات گرامی میں مختلف مقامات پر گرامی نے اقبال کو اپنا خراج عقیدت اسطرح پیش کیا ہے

درس ماضی از کتاب حال گیر ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرت اقبال آں بالغ نظر دارد از بود و بنود ما خبر
ما بہ ذوق سوختن کم ساختیم بے خودی را از خودی نشناختیم
آں نوا پرداز اسرار ازل شہسوار عرصہ علم و عمل
بیخودی را در خودی منزل شناس در غبار کارواں محمل شناس
از نوائیش بزم یورپ در خروش حکمت امریکہ را او سفتہ گوش
نالہ ہائے آتشین آں حکیم سوخت رفت فتنۂ امید و بیم
ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست سوخت دل ہا را و دودش ہیچ نیست

یہ نظم باقیات اقبال میں "نذرانہ عقیدت بزبان گرامی" کے عنوان سے درج ہے۔

ظہوری کی ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

ستم و سخت جانی ہم ہست
کہ ہم و ناتوانی ہم ہست

گرامی نے اس پر ایک غزل کہی جو فروری ۱۹۲۷ء کے "تعارف" میں شائع ہوئی اس میں ایک مصرعہ اس طرح تھا۔

فقر را ترکمانی ہم ہست

اقبال کو یہ مصرعہ بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے اس پر تضمین کر کے اسے اور روشن کر دیا۔ انہوں نے ایک مکتوب میں سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ "پیام مشرق" میں اسے اس لئے شامل نہ کیا کہ اسکے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو پھر ارشاد ہو کوئی عذر نہیں اس پر مولانا نے انہیں لکھا۔

Scanned with Oken Scanner

"یہ سچ ہے کہ "پیامِ مشرق" کے ساز میں یہ لحنِ شیرازی کچھ زیادہ سامع نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے" ۱؎

تضمین اسطرح ہے

سخنے راندۂ کہ جز قرشی — بر سر مسند نبیؐ نہ نشست
درس گیر از گرامی ہمہ درد — کہ برید از خود و باد پیوست
رمز ترک و خلافت عربی — گفت آں مے گسار بزم الست
ماہ را بر فلک دو نیم کند — فقر را تر کمانی ہم ہست

گرامی نے اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کی ولادت پر بھی چند رباعیات کہی تھیں جو "رباعیات گرامی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

جاوید امید ڈاکٹر سر اقبال — ناوردہ بدہر مادر دہر مثال
در رشتہ عمرش چہ مبارک گہری ہست — تمہید کشاد آرزوہا ہر سال
جاوید اقبال سرو باغ اقبال — بالیدہ در آغوشِ ادب مثلِ ہلال
سر خطِ رموز منی دانش و عقل — سر جلوۂ ذوق نکتہ و ماضی و حال

ان رباعیات سے اقبال اور گرامی کے باہمی مراسم کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ گرامی نے ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں چند رباعیات پڑھی تھیں جن سے اقبال کی عظمت، خدا داد صلاحیت، ہمہ گیر شہرت اور جذبۂ اخوت کے متعلق ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ چند رباعیات پیش ہیں۔

۱؎ معارف۔ فروری ۱۹۲۷ء ۔ ص ۱۴۴

۲؎ باقیات اقبال میں کینم لکھا ہے۔

حکمت آموز حال و استقبال   وہ چہ علامہ الست سر اقبال
می دہد جلوہ حال را در قال   گوشئے را جواب سر اقبال
الہام بود ہمہ کلام اقبال   شہباز معانی ست بدام اقبال
سر بر خط او ہند گرامی کہ قضا   زد سکۂ خسروی بنام اقبال
اقبال کہ نظم او ادب پیغام است   سر جلوۂ آغاز و فا انجام است
بر خیز کہ جلوہ ریزاں جو ہر فرد   در انجمنِ حمایت اسلام است

اقبال نے اپنے ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں گرامی کو اسطرح خطاب کیا۔

"گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہر موسویت و ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہوئی ہیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اُسے کون جذب کرے! مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و موت کا تناقص مٹا چکی ہے" ؎۱

گرامی کو اقبال سے بڑی محبت تھی چنانچہ مرض الموت کے ایام میں رہ رہ کر انہیں یاد کرتے تھے۔ جب ان کا (گرامی) انتقال ہوا تو اقبال نے گرامی کی وفات پر ایک درد انگیز نظم کہی جس میں اپنے دلی جذبات اور درد و الم کا اظہار کیا۔ اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم شاعر دوسرے بزرگ

؎۱ مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی) صفحات ۱۴۸ - ۱۴۹

شاعر کو خراج پیش کر رہا ہے۔ گرامی کے سانحہ ارتحال پر اقبال کا یہ مرثیہ ملاحظہ کیجیے:

آہ مولانا گرامی از جہاں بر بست رفت
آنکہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پای
معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر
مثل حور بے نقاب اندر بہشت دلکشائی
از نوائے جاں فزائے او عجم را زندگی
جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمای
یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنای
بر مزارش پشت ترکن پردہ ہائے سازرا
تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شور نوای